تیسرا فقہی سمینار

منعقدہ: ۱۳-۱۶/ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ مطابق ۸-۱۱/جون ۱۹۹۰ء، سبیل الرشاد، بنگلور

☆ اسلامی بنکاری-ضرورت ورہنما خطوط

☆ مرابحہ اور سرمایہ کاری کے لئے اس سے استفادہ

☆ غیر سودی امدادی سوسائٹیاں

☆ حقوق کی خرید وفروخت

☆ دینی وعصری اداروں کے طلبہ سے متعلق تجاویز

سوالنامہ

بیع حقوق

مسئلہ کا تعارف اور چند سوالات

بہت سی ایسی چیزیں جن کی خرید وفروخت کا کوئی تصور پچھلے زمانہ میں نہیں تھا، آج وہ چیزیں دولت اور قیمتی سرمایہ تصور کی جاتی ہیں، اور ان کی خرید وفروخت کا عام رواج دنیا کے سبھی ملکوں میں ہوگیا ہے۔ عام طور پر فقہاء احناف بیع کی تعریف میں مال کی قید لگاتے ہیں، یعنی خرید وفروخت انہی چیزوں کی کی جاسکتی ہے جو مال ہوں، اور کسی شئی کے مال قرار دیئے جانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ شئی ایسی ہو جس کو محفوظ کرلینا اور جس پر قبضہ ممکن ہو۔ اس لئے جو معنوی امور مثلاً علم، فنی مہارت یا فضا اور سورج کی کرنیں وغیرہ ہیں یہ مال میں داخل نہیں۔ شامیؒ نے مال کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

المراد بالمال ما يميل إليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة والماليه تثبت بتمول الناس كافه أو بعضهم

(ردالمختار ۴/۳)۔

اسی ذیل میں شامیؒ نے بحوالہ تلویح یہ لکھا ہے کہ: ''منافع'' ملک تو ہیں ''مال'' نہیں، اور ملک ومال کے درمیان جوہری فرق ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:

''لأن الملک ما من شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص والمال ما من شانه أن يدخر للا نتفا ع لوقت الحاجة''۔

یعنی مال کا قابل ذخیرہ ہونا تاکہ بوقت ضرورت اس سے نفع اٹھایا جاسکے۔ اور بحر نے حاوی قدسی کا یہ قول نقل کیا ہے:

المال اسم لغير الآدمي خلق لمصالح الآدمي وأمكن إحرازه والتصرف فيه علي وجه الاختيار (ردالمختار ۴/۴)۔

صاحب درمختار نے بیع کی تعریف میں لفظ ''مال'' کے بجائے ''شئی مرغوب فیہ'' کا استعمال کیا ہے، اور شامیؒ نے اس کی وضاحت یوں کی ہے:

''ما من شأنه أن ترغب إليه النفس وهو المال''۔

اور آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ تراب (مٹی) میتۃ (مردار) اور دم (خون) مال نہیں ہے۔ اسی طرح دوسرے فقہاء کی وہ تعریف جس میں بیع کو ''مبادلۃ المال بالمال'' کہا گیا ہے، اس تفسیر کے بعد صاحب تنویر الابصار کی تعریف کے ہم معنی قرار پاتی ہے۔

دیگر فقہاء کے یہاں مال کا ''مادی شئی'' ہونا ضروری نہیں بلکہ وہ حقوق ومنافع جیسی چیزوں کو بھی مال تسلیم کرتے ہیں۔ امام شافعیؒ کا قول سیوطیؒ نے اشباہ ونظائر میں نقل کیا ہے کہ ''ہر وہ شئی جس کی کچھ قیمت ہو اور اس کو ضائع کردینے پر ضمان لازم آتا ہو ''مال'' ہے''۔

قال الإمام الشافعي رضى الله عنه لا يقع اسم مال إلا على ما له قيمة يباع بها ويلزم متلفه وإن قلت وما لا يطرحه الناس مثل الفلس وما اشبه ذلک (الاشباہ والنظائر للسیوطی، ص ۲۵۸)۔

ابن القاسم الغزیؒ نے بیع کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

فأحسن ما قيل في تعريفه أنه تمليک عين مالية بمعاوضة بإذن شرعي أو تمليک منفعة مباحة على التأبيد بثمن مالي (حاشیۃ الباجوری علی شرح الغزی ۲/ ۳۴۳)۔

قاضی بیضاویؒ نے الغایۃ القصوی میں لکھا ہے:

"البيع تمليک عين أو منفعة على التابيد بعوض مالي" (۱/ ۴۵۵)۔

اسی طرح آگے چل کر معقود علیہ یعنی کونسی شئی مبیع ہوسکتی ہے اس کے ضمن میں پانی کی گذرگاہ، اور چھت پر حق تعمیر کو بھی قابل فروخت اشیاء میں شمار کیا ہے۔

حاصل یہ ٹھہرا کہ فقہاء شافعیہ کے نزدیک بیع کے لئے فروخت کی جانے والی شئی کا شئی مادی اور اعیان میں سے ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ منافع بھی محل بیع ہوسکتے ہیں۔

فقہاء حنابلہ بھی اعیان اور منافع دونوں کے مبادلہ کو بیع قرار دیتے ہیں۔ "الانصاف" میں مرداوی نے لکھا ہے کہ بیع کی تعریف میں عین یا منفعت مباحہ کا تبادلہ اس طرح کہ وہ ہمیشہ کے لئے ہو ضروری ہے (الانصاف ۴/ ۲۶۰)۔

اسی وجہ سے دوسروں کی مملوکہ اراضی میں گزرگاہ بنانا، دروازہ کھولنا، یا کسی شخص کا اپنے مکان کی چھت پر مکان تعمیر کرنے کا حق فروخت کرنا وغیرہ ایسی چیزوں کو بیع قرار دیا گیا ہے (کشاف القناع للبہوتی ۳/ ۱۹۱)۔

مالکیہؒ نے بیع کی تعریف میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بیع کو مادی اشیاء کے ساتھ خاص کرتے ہیں اگرچہ وہ حق تعلّی وغیرہ کی بیع کو جائز کہتے ہیں، اور زرقانی نے شرح مؤطا میں بیع کی تین قسمیں بیان کی ہیں: بیع عین، بیع دین اور بیع منفعت۔ مالکیہ کی ان تصریحات سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی منافع مؤبدہ کو محل بیع قرار دیتے ہیں۔

مذکورالصدر آراء کو پیش نظر رکھتے ہوئے دو اہم سوالات ابھر کر سامنے آتے ہیں:

۱- ایک تو یہ کہ بیع کی تعریف میں مال کی شرط ضروری اور جوہری ہے، یا ہر وہ شئی جس کا حاصل کرنا انسان کو مرغوب ہو، چاہے وہ چیزیں مادّی ہوں یا نہیں، خرید و فروخت کا محل ہوسکتی ہیں۔

۲- دوسرا یہ کہ اگر مال کی قید کو ضروری قرار دیا جائے تو کیا مال کا مادی اعیان میں سے ہونا ضروری ہے، یا حقوق و منافع کو بھی مال قرار دیا جاسکتا ہے؟

۳- اسی ذیل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مال کی حقیقت کیا شرع اور لغت نے متعین کردی ہے، یا اس کا تعلق ہر عہد کے عرف سے ہے، بہت سی ایسی چیزیں ہوسکتی ہیں جو کسی زمانہ میں نہ ذریعہ تموّل تھیں اور نہ ان کی کوئی حاجت اور اہمیت تھی، لیکن بعد کے زمانہ میں وہی شئی ضروری ہوگئی ہے اور ذریعہ تموّل بھی، مثلاً ریت اور مٹی، جس کے مال ہونے کا تصور سلف میں نہیں تھا، لیکن آج وہ ذریعہ تمول بھی ہے اور انسانی حاجت بھی۔

فقہاء نے مٹی کو مال نہیں قرار دیا لیکن آج وہ قیمتی مال ہے۔ ریت سمینٹ میں ملا کر مکانات کی تعمیر میں کام کرتی ہے، اور مٹی شہروں ہی میں نہیں اب تو دیہاتوں میں بھی خریدی جاتی ہے۔

اسی طرح فضا یعنی کسی مکان کی چھت پر دوسرا مکان تعمیر کرنا اور اس کام کے لئے زمین کے مالک کا گراونڈ فلور اور اس کے اوپر پہلی،

دوسری اور تیسری منزل کی تعمیر کا حق مختلف اصحاب سے فروخت کرنا ایک عام بات ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور خاص کر قصبہ، شہروں اور بڑی آبادیوں میں رہائش کے لائق اراضی کا کم ہوتا جانا، اور قیمتوں کا بڑھتا جانا ایک بڑا سماجی مسئلہ بن گیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں یہ رواج تیزی سے بڑھتا جارہا ہے کہ مالک اراضی یا تو کئی منزلہ فلیٹس بنا کر اس طرح فروخت کرتے ہیں کہ ہر منزل کی مکانیت اور جس حد تک فضا پر وہ مکان حاوی ہے جملہ حقوق کے ساتھ مختلف افراد کے ہاتھوں فروخت کردی جاتی ہے، یا نچلی منزل بنانے کا حق ایک شخص کے ہاتھ، اس کے اوپر مکان بنانے کا حق دوسرے شخص کے ہاتھ، اور اس کے اوپر تیسرے شخص کے ہاتھ فروخت کیا جاتا ہے۔ اس طرح خاص کر متوسط طبقات کے لئے ''کم خرچ بالانشیں'' کا مصداق یہ طریق کار رہائشی دشواریوں کے عالمگیر مسئلہ کا حل بن کر ابھرا ہے۔

اسی طرح انسانوں کی ذہنی، فکری اور دماغی صلاحیتوں سے جو شئی وجود میں آتی ہے اگرچہ وہ اشیاء مادّی نہیں ہوتیں، لیکن قابل انتفاع اور خرید وفروخت کا محل بنتی ہیں، مثلاً ایک شخص برسہابرس کی محنت کے بعد کینسر کی ایک دوا ایجاد کرتا ہے، یا مختلف صنعتی آلات کے نمونے ایجاد کرتا ہے، مختلف سائنسی انکشافات اور فارمولے ایجاد کرتا ہے۔ تحقیقی کتابیں لکھتا ہے، ایک مصوّر اپنی بہترین دماغی صلاحیتیں خرچ کرکے ایسی تصویریں تیار کرتا ہے جنکی بازار میں قیمت ہے، ان تمام ہی صورتوں میں یہ کہا جانا چاہئے کہ موجد، مصنف اور فن کار کو تحقیق پر ایک ایسا خصوصی اختیار حاصل رہتا ہے جسے اس کی ملک کہا جاسکتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ اشیاء مادّی نہیں ہیں اس لئے مال کی عام تعریف میں داخل نہیں۔ اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ:

۱- مال کی تعریف میں مذکور یہ شرط کہ اس کو قابل ذخیرہ ہونا چاہئے کیا یہ شرط جوہری ہے؟

۲- اور اگر اس کو جوہری جز مال کی تعریف کا تسلیم کرلیا جائے تو کیا ہر شئی کو ذخیرہ کرنے اور قبض ودخل کی ہر شئی کے لائق علاحدہ صورتیں ہوں گی، یا وہی صورت متعین ہے جو عام طور پر معروف ہے، یعنی مادی شئی کسی الماری میں بند کی جاسکتی ہے۔ سبزیاں (خضراوات) چند گھنٹوں کے بعد خراب ہونے لگتی تھیں، اب کولڈ اسٹورز میں سالہا سال بھی محفوظ رکھی جاتی ہیں، اسی طرح مختلف چیزوں کو محفوظ کرنے اور ذخیرہ کرنے کی مختلف صورتیں اس شئی کی شان کے مناسب ہوسکتی ہے۔ اس ذیل میں شامیؒ کی اس صراحت کو سامنے رکھنا چاہے کہ مال کے قابل تصرف اور قابل انتفاع ہونے کی شرط پر جب یہ اعتراض ہوا کہ غلام کو حقیقت مال نہیں کہا جاسکتا کہ کسی غلام کو ہلاک کردینا اور قتل کردینا جائز نہیں ہے تو شامیؒ کو یہ اعتراض پسند نہیں آیا اور انہوں نے جواب دیتے ہوئے ایک اصول کی طرف اشارہ کیا، یعنی'' ہر شئے سے انتفاع کی صورت اس شئی کی خاص نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہوگی''۔

ولأن الانتفاع بالمال يعتبر في كل شيء بما يصلح له.

کیا اسی طرح یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مالیت کے لئے قابل ادخار ہونے کی جو شرط ہے وہ مختلف اشیاء کے اعتبار سے ہر ایک کی حالت کے مطابق علیحدہ علیحدہ ہوگی؟

مثلاً کوئی ایجاد، فارمولا، نام اور ٹریڈ مارک اگر کسی سرکاری قانون کے ذریعہ رجسٹرڈ کرائے جائیں تو یہ سمجھا جائے کہ یہ مال وقت ضرورت کے لئے ذخیرہ کرلیا گیا ہے یا کوئی اور صورت؟

حقوق کا مسئلہ

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ حق کی کیفیت کیا ہے، اہل لغت نے جتنے معانی بھی بتائے ہیں ان میں بنیادی طور پر ثبوت اور وجود کا مفہوم موجود ہے۔ جیسے ارشاد باری تعالی ہے:

”لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَى أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لاَ يُؤْمِنُونَ“ (یس/۷)۔

” لِيُحِقَّ الْحَقُّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ“ (انفال/۸)۔

متعین حصہ کو بھی حق کہتے ہیں: ”فِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ“۔ مولانا عبدالحلیم لکھنوی نے ”نورالانوار“ کے حاشیہ ”قمر الاقمار“ میں حق کی فقہی تعریف ”الحکم الثابت شرعاً“ نقل کی ہے۔ شیخ مصطفیٰ الزرقا نے ”المدخل الفقهی العام“ میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کرکے حق کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں متعین کی ہے: ”الحق هو اختصاص يقرر به الشرع سلطة وتكليفاً “ یعنی حق ایک خصوصی تعلق کا نام ہے، جس کی وجہ سے شریعت کسی اختیار یا ذمہ داری کو تسلیم کرتی ہے مثلاً نابالغہ لڑکی کے نکاح کا اختیار ولی کو حاصل ہے۔ یہ ایک ایسا اختصاص ہے جس کی وجہ سے شریعت ولی کا اپنے زیرولایت افراد پر اختیار تسلیم کرتی ہے، یا بائع کو مشتری سے ثمن کے مطالبہ کا اختیار ایک حق ہے جس کی وجہ سے مشتری پر ایک ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اسی طرح وارث کا حق مورث کے ترکہ پر، پس حق ایک خصوصی تعلق ہے جس کا محل مالی بھی ہوسکتا ہے، جیسے دین واجب فی الذمہ کا استحقاق، اور غیر مالی بھی ہوسکتا ہے، جیسے ولی کا اور وکیل کا استحقاق۔ اس اختصاص کی قید سے وہ عام مباحات جن کی حیثیت محض رخصت کی ہے خارج ہوجاتی ہیں، جیسے کسی دریا میں مچھلی کا شکار کوئی بھی شخص کرسکتا ہے، یا ”ارض الموات“ پر تصرف یا ٹرین کے عام کمپارٹمنٹ اور مسجد کی صفوں میں کہیں بھی بیٹھ جانا ہر شخص کے لئے جائز ہے۔ مگر کسی بھی ایسی عام مباح چیز پر اگر کوئی شخص قبضہ کرلیتا ہے تو اسے اختصاص حاصل ہوجاتا ہے جسے ”حق اسبقیت“ کہہ سکتے ہیں۔

حق کی تعریف میں جس اختیار و تسلط کا ذکر کیا گیا ہے یہ اختیار کسی بھی شخص پر بھی ہوسکتا ہے، اور کسی شئی معین پر بھی، جیسے حق ولایت میں شخص پر، حق حضانت میں بچہ پر، اور حق ملکیت میں کسی شئی معین پر، ذمہ داری (تکلیف) کسی انسان کے ذمہ ہی ہوسکتی ہے، لیکن وہ شخص جس پر ذمہ داری عائد ہوا سے ہم دو قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں: شخص حقیقی اور شخص اعتباری۔

شخص اعتباری وہ ادارے، کمپنیاں، اوقاف اور مساجد و مدارس وغیرہ ہیں جو اپنی اجتماعی ہیئت میں ایک شخص کا درجہ رکھتے ہیں، اور انکے کچھ اختیارات بھی ہوتے ہیں، اور ان کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں، اگر شرع کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو اس کی نظیریں بھی مل سکتی ہیں، حق کی تعریف ان حقوق کو بھی شامل ہے جو اللہ کے حقوق ہیں جیسے عبادات یا جن سے اخلاقی ذمہ داریاں پیدا ہوتی ہیں جیسے والدین اور اولاد کے باہمی حقوق، یا زوجین کے ایک دوسرے پر باہمی حقوق۔ اسی طرح حکومت اور شہریوں کے درمیان باہمی حقوق وغیرہ۔ حقوق کی اس تعریف پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اعیان اور مادّی اشیاء کو حقوق کے ذیل میں شمار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ شاید اسی لئے فقہاء احناف حقوق کو مال کے برابر میں ذکر کرتے ہیں۔

حقوق کی قسمیں:

حقوق مالی بھی ہوسکتے ہیں اور غیر مالی بھی، پھر حق مالی یا حق شخصی ہوگا، جو دو شخصوں کے درمیان ایسے شرعی تعلق کو کہیں گے جس کی بنا پر ایک شخص دوسرے شخص کے لئے ایسا عمل کرنے کا ذمہ دار ہوگا جس میں دوسرے شخص کا کوئی مفاد ہو، جیسے بائع مبیع کو مشتری کے حوالے کردینے کا ذمہ دار ہے۔

حق عینی سے مراد وہ حق ہے جو کسی شخص پر نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک شخص اور کسی مادّی متعین شئے کے درمیان آتا ہے، جیسے کسی شخص کے لئے اپنے مملوکہ مکان میں رہائش یا اسے فروخت کرنے کا حق، اسی طرح کسی خاص زمین پر گذرنے یا پانی بہانے کا حق وغیرہ۔

اسی ذیل میں حق کی ایک تیسری قسم وہ ہے جسے اس عہد کی پیداوار کہا جاسکتا ہے جو موجودہ تمدنی، اقتصادی اور سماجی حالات نے پیدا کیا ہے، اور جنہیں آج کے زمانہ میں مختلف عصری قانون سازیوں کے ذریعہ منظم کیا گیا ہے، اس عہد کا قانون انہیں ''حقوق ادبیہ'' (INTELLECTUAL PROPERTY) کا نام دیتا ہے، جیسے ہر موجد، مصنف اور محقق کے فکری نتائج چاہے وہ کسی فن سے تعلق رکھتے ہوں، یا صنعت وحرفت سے، آج کے دور میں ایسا سمجھا جاتا ہے کہ ایسے اصحاب کو اپنی ایجادات اور اپنے فکری نتائج پر ایسا حق حاصل ہے کہ وہ اس کی نشر واشاعت کو ذریعہ آمدنی بناسکتے ہیں، اسی ذیل میں مختلف تجارتی اداروں کے ٹریڈ مارک، مختلف مصنوعات کی خاص علامتیں، رسائل و اخبارات، تصنیفات وفارمولے، اور ایجادات داخل ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ حقوق نہ کسی شخص پر ہیں اور نہ کسی مادّی متعین شئے پر، ان حقوق کو تسلیم کئے جانے کی بنیاد یہ ہے کہ کسی شخص کی ذہنی صلاحیت اور اس کی محنت کا ثمرہ اسے ملنا چاہئے اور غیر مادّی ہونے کے باوجود یہ ذریعہ تمول ہے، اس لئے اس کو مال کا درجہ ملنا چاہئے۔ یا کسی شخص نے اگر اپنی تجارت کی ایسی ساکھ قائم کرلی ہے کہ اس نام کی ایک قیمت ہوگئی ہے۔ اور دوسرا شخص اس نام اور شہرت کے ذریعہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو وہ اس کی قیمت ادا کرنے کا پابند ہے۔

پھر حقوق کی دوسری تقسیم یہ کی جاتی چاہئے کہ کسی شخص کو کوئی حق شریعت محض اس لئے دیتی ہے کہ اس کو ضرر اور نقصان سے بچایا جاسکے، جیسے حق شفعہ کی مشروعیت محض اس لئے ہے کہ ضرر جوار سے وہ شخص محفوظ رہے، اور بعض حقوق ایسے ہیں جن کی مشروعیت اصالتاً ہے، مثلاً ایک شخص اوقاف کے مصارف میں وظیفہ پانے کا مستحق ہے کہ وہ واقف کی صراحتوں کے ذیل میں ہے، پس یہ حق ضرر کے لئے نہیں بلکہ بذاتِ خود مشروع ہے۔

مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے حق کی ایک اور تقسیم کی ہے، وہ کہتے ہیں: حقوق شرعیہ وہ ہیں جن کا ثبوت نص سے ہو، اور حقوق عرفیہ جن کا مدار ثبوت محض عرف وتعامل ہو، اس لئے کہ بعض ایسے حقوق ہیں جن کا ثبوت نصوص شرعیہ سے تو نہیں ہوتا لیکن عرف وتعامل کی وجہ سے شرع انہیں حق تسلیم کرتی ہے، جیسے راستہ پر چلنے کا حق، پانی لینے کا حق، پانی بہانے کا حق وغیرہ۔ ان حقوق عرفیہ کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱- وہ حقوق جن کا تعلق ان منافع سے استفادہ کرنا ہے جو مادّی اشیاء کی ذات سے متعلق ہے جیسے حق مرور، حق تعلّی، حق تسییل، حق شرب وغیرہ۔ ان حقوق کو فقہاء احناف حقوق مجردہ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲- حقوق عرفیہ کی دوسری صورت وہ ہے جسے حق اسبقیت کہنا چاہئے یعنی ایک عام مباح چیز پر جب ایک شخص پہلے قبضہ کرلیتا ہے

تو اس اولیت کی وجہ سے اس شئی پر اسے ایسا اختصاص حاصل ہوجاتا ہے جو شرعاً اس کو ایک اختیار عطا کرتا ہے مثلاً کسی غیر مزروعہ زمین پر کسی شخص نے جھونپڑی بنالی یا قابل زراعت بنالیا یا اس کا احاطہ کرکے قبضہ ودخل میں لے لیا وغیرہ وغیرہ۔

یہ اور اس طرح کی بہت سی صورتیں ہیں جن کو سامنے رکھ کر حقوق کی مختلف اقسام متعین کی جاسکتی ہیں، اور ہر قسم کے لئے شرعی احکام کا متعین کرنا بھی ضروری ہے، مولانا محمد تقی عثمانی نے اپنے مقالہ میں حقوق کی جو تقسیم کی ہے اس کا حاصل یہ ہے ''حقوق شرعیہ اور حقوق عرفیہ''۔

اور دونوں ہی قسم کے حقوق یا اصالتاً ثابت ہوں گے یا دفع ضرر کے لئے۔ اس ذیل میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ کسی حق کا معاوضہ حاصل کرنے کی بھی دو صورتیں ہیں: یا حقوق فروخت کردیئے جائیں اور ان کی قیمت وصول کی جائے، یا کوئی شخص کوئی عوض لے کر دوسرے شخص کے حق میں اپنے حق سے دستبردار ہوجائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ دور میں مختلف قسم کے حقوق کی بیع کا جو رواج اور تعامل ہے اور جنہیں موجودہ عہد کے سماجی، تمدّنی اور معاشی حالات نے پیدا کیا ہے، انہیں پیش نظر رکھتے ہوئے یہ طے کیا جائے کہ:

۱- بیع کی حقیقت کیا ہے؟

۲- مال کی حقیقت کیا ہے؟

۳- قابل ادخار ہونے کا کیا مفہوم ہوسکتا ہے؟

۴- حقوق کی بیع جائز ہے یا نہیں، اگر ہے تو کس قسم کے حقوق کی بیع جائز ہے، اور کس قسم کے حقوق کی بیع جائز نہیں ہے؟

۵- حق سے دستبرداری (تنازل عن الحق) کا معاوضہ لینا جائز ہوگا یا نہیں؟ اگر ہاں تو کس قسم کے حقوق کا ہے، یہ اور اس طرح کے مختلف سوالات اور متعین طور پر ان حقوق کے بارے میں حکم شرعی کی تعیین جو آج کے عرف ورواج میں بیچے اور خریدے جارہے ہیں بے حد ضروری ہے۔

براہ کرم مندرجہ بالا سوالات پر اپنے تحقیقی جوابات سے مستفید فرمائیں۔ نیز ایک ایسا اصولی ضابطہ مرتب فرمائیں جس کے ذریعہ یہ امر واضح ہوکر سامنے آجائے کہ کون سی قسم کے حقوق کا معاوضہ بصورت تنازل عن الحق (دستبرداری) وصول کیا جاسکتا ہے اور کس قسم کے حقوق کی خرید وفروخت اور معاوضہ لینا بہرحال درست نہیں ہوگا۔

مجھے یقین ہے کہ جناب والا اپنا قیمتی وقت صرف فرماکر اس اصولی مسئلہ پر اپنی قیمتی تحریر سے شرکاء کو مستفید ہونے کا موقع دیں گے۔

☆☆☆

سوال نامہ:

مرابحہ

مرابحہ کی سادہ شکل یہ ہے کہ فروخت کرنے والا اپنی قیمت خرید یا لاگت کو بتا کر یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اسے اس لاگت پر متعین فیصد منافع مطلوب ہے، اور خریدار اسے منظور کرتا ہے۔ مرابحہ اپنی سادہ صورت میں جائز ہے، اور اس کی بنیاد امانت پر ہے، یعنی بائع کو ہر قیمت پر صحیح لاگت بتانی چاہیے۔ بعض خاص قسم کے اخراجات یعنی نقل وحمل Transportation کے اخراجات کو اصل قیمت کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے مثلاً دس ہزار روپے کا اصل مال ہے اور سو روپے اس کے لانے پر خرچ پڑے ہیں تو اصل قیمت دس ہزار اور لاگت دس ہزار ایک سو قرار پاتی ہے، ایسی صورت میں قیمت میں جوڑے جانے والے ان زائد اخراجات کو قیمت کا جز بنا کر ذکر نہیں کیا جانا چاہیے یعنی بائع کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ اس مال کی قیمت دس ہزار ایک سو روپے ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ اس مال کی خرید پر لاگت دس ہزار ایک سو روپے آئی ہے۔

مرابحہ سے متعلق ضروری تفصیلی احکام کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی ملحوظ رکھی جانی چاہیے کہ عام طور پر تھوک خریداری یا کسی ہول سیلر Whole Seller سے مسلسل معاملہ رکھنے کی صورت میں Discount یا Concession یا Commission وغیرہ کے نام سے اصل قیمت میں کچھ کمی کردی جاتی ہے۔ مثلاً اگر دس ہزار روپئے کسی شئی کی قیمت ہے اور اس میں دس فیصد کمیشن ملتا ہے تو کل نو ہزار روپئے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس صورت میں جو شخص بیع مرابحہ کر رہا ہے اسے مال کی قیمت جس پر وہ منافع لے رہا ہے، دس ہزار نہیں بلکہ نو ہزار بتانی چاہیے، عقد مرابحہ میں قیمت کے بیان کے سلسلہ میں جس امانت داری کی رعایت رکھی گئی ہے اس کا یہی تقاضا ہے۔

عقد مرابحہ کو آج اسلامی بینکنگ میں جس طرح استعمال کیا جا رہا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ عام طور پر مرابحہ نقد خرید وفروخت میں نہیں بلکہ ادھار کی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ ادھار کی بھی دو صورتیں ہیں: یکمشت ادائیگی، یا بالاقساط ادائیگی۔ بہر دو صورت فروخت کرنے والا آج کے نرخ کے مقابلہ میں قیمت زیادہ رکھتا ہے، اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مدّت ادائیگی کی کمی اور زیادتی کے مطابق مقررہ منافع میں بھی کمی اور زیادتی کی جاتی ہے، جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بائع اس ادھار بیع میں تأجیل (مہلت دینے) کی قیمت وصول کر رہا ہے۔

۱- اس ذیل میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی شئی کو نقد بیچنے کی قیمت علیحدہ اور ادھار بیچنے کی قیمت علیحدہ رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ ایک قسم کا استحصال اور اس شخص کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا نہیں ہے جو ضروری مطلوبہ سامان نقد نہیں خرید سکتا اس لئے اسے ادھار خریدنا پڑ رہا ہے، اور آج کے نرخ کے مقابلے میں اسے اس شئے کی زائد قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے؟

واضح رہے کہ ہوسکتا ہے کہ بائع کی قیمت خرید مزید کمیشن اور ڈسکاؤنٹ (Discount) ملنے کی وجہ سے عام بازار کے نرخ سے کم ہو اور مطلوبہ منافع جڑنے کے بعد اتنی قیمت بنتی ہو جو آج کے بازار میں اس شئے کی ہے، یا معمولی مقدار میں زائد اور کم ہو، اور کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ منافع کی مقدار اتنی زائد رکھی جائے کہ آج وہ شئی بازار میں جس نرخ پر دستیاب ہے اس سے غیر معمولی حد تک زائد رقم خریدار کو ادا کرنی پڑے۔

۲-مزید برآں اس ذیل میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ بائع جو ادھار فروخت کر رہا ہے اس کے روپے جب اسے دو سال بعد ملیں گے تو ان کی مالیت (Value) آج کے مقابلہ میں کم ہو جائے گی۔ پس وہ آج کے نرخ سے زائد رقم کی مالیت میں کمی ہو جانے کے پیش نظر منافع میں مناسب اضافہ بیع کی صورت میں کر رہا ہے اس لئے اسے جائز ہونا چاہیے؟

۳-مرابحہ کے ذیل میں ہی ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عام طور پر یہ مالیاتی ادارے اپنی کوئی دکان یا گودام نہیں رکھتے جس میں مطلوبہ سامان موجود ہو بلکہ جب کوئی ضرورت مندان کے پاس آتا ہے تو وہ اس کے ساتھ لاگت اور منافع کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد اس ضرورت کے سامان کی خریداری بازار سے کرتے ہیں، اور پھر اس شخص کو وہ سامان حوالہ کرتے ہیں، تو کیا یہ اُس شئی کی بیع نہیں ہے جو بائع کی ملک میں موجود نہیں ہے؟ بیع مالا یملک (اس شئی کو بیچنا جو بائع کی ملکیت میں نہ ہو) ممنوع ہے، اس ذیل میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جس وقت ایک ضرورت مند نے آ کر ادارہ میں اپنی ضرورت کا اظہار کیا اور معاملات سے متعلق ضروری شرائط طے پائیں، یہ محض بیع کا معاہدہ ہے یا بیع ہے؟ اگر اسے معاہدہ تسلیم کیا جائے تو بیع اس وقت قطعی ہوگی جب شئی خرید کر ادارہ اسے حوالہ کرے گا۔ لیکن اس میں ایک سوال ضرور پیدا ہوگا کہ یہ بیع نہیں وعدہ بیع ہے، تو اس وعدہ کو پورا کرنا قانونی طور پر لازم ہوگا یا نہیں؟

۴-اس ذیل میں تیسری اہم بات یہ بھی ہے کہ ضرورت مند اور ادارہ کے درمیان مطلوبہ شئے کی خریداری، اس کی لاگت اور اس پر مطلوبہ منافع طے ہو جانے کے بعد اگر ادارہ اسی شخص کو روپے دے کر سامان خریدنے کے لئے بازار بھیج دے، اور وہ شخص اپنی مطلوبہ شئے بازار سے اس مالیاتی ادارہ سے ملنے والے روپے ادا کر کے خرید لے، اور پھر وہ رقم مع زائد منافع بالاقساط ادا کرتا رہے تو آیا یہ جائز ہوگا یا نہیں؟ بعض لوگوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ شخص دو حیثیت رکھتا ہے، جب وہ بازار سے خریدتا ہے تو وہ اس مالیاتی ادارہ کا وکیل بالشراء (Purchasing Agent) ہوگا، اور پھر وہ اس شئے پر مالکانہ حیثیت سے قبضہ کرتا ہے تو وہ مالیاتی ادارہ کے سامنے خریدار ہوتا ہے، یعنی اس کا اولین قبضہ قبضۂ وکالت ہے، اور دوسرا قبضہ قبضۂ مشتری ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ صورت جائز ہوگی یا نہیں؟

☆☆☆

سوالنامہ:

بینک انٹرسٹ وسودی لین دین

قرآن وسنت میں ربوا کی حرمت جس شدت وقطعیت کے ساتھ بیان کی گئی ہے وہ اہل علم پر مخفی نہیں، دوسری طرف موجودہ ربوا کے بینکنگ نظام نے ایسی صورت حال پیدا کردی ہے کہ سماج کے اکثر افراد خصوصا اعلی اورمتوسط طبقہ کا بینکوں سے برابر واسطہ پڑتا ہے، بینکوں سے معاملات پڑنے کی وجہ سے ربوا کے بارے میں مختلف قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں، جن کے بارے میں عصر حاضر کے بابصیرت فقہاء اور ارباب افتاء کا اجتماعی فیصلہ امت مسلمہ کے سامنے آنا چاہیئے، اسی طرح حکومت ترقیاتی اسکیموں کے تحت قرضے تقسیم کرتی ہے اوران قرضوں پر کچھ سود بھی وصول کرتی ہے، ان ترقیاتی قرضوں کے بارے میں جو فقہی سوالات ابھرتے ہیں وہ بھی اصلا ربوا ہی کے مسئلہ سے مربوط ہیں، اس نوعیت کے بہت سے مسائل اس بات کے متقاضی ہیں کہ ربوا کے بارے میں چند اصولی باتیں طے کرکے اہم سوالات کے شرعی جوابات دیئے جائیں، اس پس منظر میں مندرجہ ذیل سوالات وتنقیحات جواب وتحقیق کے لئے پیش خدمت ہیں۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی اہم سوال یا تنقیح رہ گئی ہوتو اسے بھی شامل کرلیں۔

۱- ربوا کی شرعی حقیقت کیا ہے؟ اوراس کا دائرہ کیا ہے؟

۲- کیا دارالحرب میں سودی معاملات، حقیقت قرار نہیں دئے جاسکتے، اس وجہ سے کہ اموال اہل حرب معصوم اور قابل ضمان نہیں، اور سود کے تحقق کے لئے بدلین کا معصوم ومتقوم ہونا ضروری ہے، لہذا اس شرط کے مفقود ہونے کی وجہ سے حقیقت ربوا کا تحقق ہی نہیں ہوگا اگر چہ وہ معاملات صورۃً سودی معاملات ہوں؟

۳- دارالحرب اوردارالاسلام کی تعریف کیا ہے اور شرطیں کیا ہیں، اور کیا موجودہ حالات میں ''دار'' کا حصر دارالاسلام اوردارالحرب میں درست ہے، کیا ہندوستان (جیسا ملک جہاں ایک دستوری حکومت، تمام شہریوں کے مساوی حقوق کی بنیاد پر قائم ہے اور قانونی و دستوری نقطۂ نظر سے بلاتفریق مذہب وزبان وعلاقہ ہر شہری کو اپنے مذہبی شعائر کی آزادی کے ساتھ ملک کے وسائل آمدنی سے منتفع ہونے کا مساوی حق ہے) دارالحرب ہے؟ اگر دارالاسلام اوردارالحرب کے علاوہ دار کی کوئی تیسری قسم ہے تو وہ کیا ہے اوراس کی شرطیں کیا کیا ہیں؟

۴- بینکوں میں جمع شدہ رقوم پر جو سود ملتا ہے اس کا بینکوں سے لینا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے، اور لینے کے بعد اسے کس مصرف میں خرچ کیا جائے، سرکاری بینکوں اور غیر سرکاری بینکوں سے سود لینے کے حکم میں کوئی فرق ہے؟

۵- سود لینے اور دینے کے حکم میں کیا کوئی فرق کیا جاسکتا ہے، اور کیا غیر اسلامی ملک میں واقعی کچھ ایسی مجبوریاں ہوسکتی ہیں جن کی بنیاد پر سود دینا جائز ہو؟

۶- کیا سودی قرضے لینے کی کسی حال میں شرعاً گنجائش ہے؟ کن حالات اور کن مجبوریوں کے تحت مسلمان کے لئے سودی قرض لینا جائز ہوسکتا ہے؟

۷- حکومت ترقیاتی اسکیموں، مکانات کی تعمیر، تجارت کی ترقی، صنعت وحرفت کی ہمت افزائی نیز بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے کے لئے جو سودی قرضے تقسیم کرتی ہے اس کا لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اس کا حکم عام سودی قرضوں کی طرح ہے یا اس سے کچھ مختلف ہے؟

کیا اس بنیاد پر حکومت کے سودی قرضوں کا لینا جائز قرار پا سکتا ہے کہ حکومت ہند ترقیاتی قرضوں کے لئے جو رقم مختص کرتی ہے وہ اس کی مختلف ذرائع سے ہونے والی آمدنی کا ایک حصہ ہوتا ہے اور جمہوری حکومت کے خزانہ عامہ کی مالک اس ملک کے شہریوں کی مجموعی اکائی ہوتی ہے، اس خزانہ عامہ میں سے جو رقم ترقیاتی اسکیموں کے لئے مختص کی گئی ہے، اس سے انتفاع کا حق عام ہندوستانی شہریوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حق حاصل ہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ مسلمان اپنے اس حق کی تحصیل کے لئے جب آگے بڑھتا ہے تو ان قرضوں پر سود عائد کرنے کی پالیسی آڑے آتی ہے، لہذا جس طرح اپنا حق وصول کرنے کے لئے بہت سے فقہاء نے رشوت دینے کو جائز کہا ہے اسی طرح یہاں حق وصول کرنے کے لئے مجبوراً سود دینے کی اجازت کیوں نہ دی جائے؟

۸- اگر حکومت کسی قرض پر کوئی چھوٹ بھی دیتی ہو اور اس پر سود بھی عائد کرتی ہو تو اگر چھوٹ کا تناسب سود کے مساوی ہے تو کیا اس قرض لینے کو شرعاً جائز کہا جائے گا؟

۹- غیر ممالک سے تجارت کی صورت میں بسا اوقات سود ادا کئے بغیر چارہ نہیں، مال کی روانگی کے دن سے ہی سود لگا دیا جاتا ہے اور اسی طرح اگر کوئی تاجر دیگر ممالک کو مال برآمد کرے تو بین الاقوامی تجارتی ضوابط کے تحت اسے سود ملتا ہے، درآمد برآمد کی اس تجارت میں سود سے نجات مشکل ہے، ان صورتوں کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟

۱۰- بینک دو طرح کے ہیں ایسے بینک جس کے مالک اشخاص وافراد ہوتے ہیں اور دوسرے سرکاری بینک جو حکومت کی ملکیت ہے، کیا قرض لے کر سود ادا کرنے کے بارے میں دونوں قسموں کے بینکوں کے حکم میں کچھ فرق ہوگا؟

۱۱- کچھ افراد یا کمپنیاں سرمایہ کرتی ہیں یعنی صنعت وحرفت اور تجارت کے لئے سرمایہ فراہم کرتی ہیں اور اس پر سود لیتی ہیں، مثلاً کوئی شخص اگر ٹرک حاصل کر کے چلانا چاہتا ہے تو وہ اپنی پسند کا ٹرک خریدتا ہے، سرمایہ کار اس کی قیمت ادا کرتا ہے اور قسط وار اپنا سرمایہ مع سود وصول کر لیتا ہے، سرکاری بینکوں سے سرمایہ حاصل کرنے میں ضابطہ کی خانہ پوری طول عمل کا موجب ہوتی ہے، دوسری طرف رشوت دینی پڑتی ہے، تیسری طرف انکم ٹیکس وغیرہ کے مسائل ہوتے ہیں، ان سے بچنے کے لئے عام طور پر تاجر وصنعت کار پرائیویٹ سرمایہ کاروں سے معاملہ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، کیا کسی مسلمان کے لئے یہ جائز ہوگا کہ ان پرائیویٹ سرمایہ کاروں سے اپنی صنعت وتجارت کی ترقی کے لئے سرمایہ حاصل کرے اور اس پر سود ادا کرے، واضح رہے کہ یہ صورت حاجت واضطرار کی نہیں ہے۔

☆☆☆

ضمیمہ سوال نمبر ۲:

بعض معاملات جو سودی معاملات کہے جاتے ہیں

کیا وہ بہ اعتبار شرع بھی سودی معاملات ہیں

سود کو اسلام نے مطلقاً حرام قرار دیا ہے، یہ بات شبہ کی ادنی ترین رمق سے بھی پاک ہے، دوسری بات یہ کہ سود خواہ مفرد ہو یا مرکب، خواہ جسے انگریزی میں (INTEREST) کہا جاتا ہے، یا وہ جس کے لئے انگریزی کا لفظ (USUARY) ہے، اپنی تمام صورتوں میں حرام ہے، شرح سود کی کمی بیشی یا شرائط ادائیگی میں سختی یا سہولت کے عوامل سود کی مطلق حرمت پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتے، اسلام کی نظر میں یہ اتنا سنگین گناہ ہے کہ اس کی طرح کا وسیع الاطراف گناہ کوئی اور نہیں، یعنی سود کا لینے والا دینے والا سودی معاملہ کی دستاویز لکھنے والا اور اس پر گواہ بننے والا، سب کو یکساں درجہ کا گناہ ہوگا، مزید یہ بات بھی اہم ہے کہ اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں کو بعض شرائط کے تحت خنزیر پالنے کھانے شراب کشید کرنے اور استعمال کرنے حتی کہ اپنے منادر وکلیسا بنا کر شرک جیسا شریعت کی نظر میں نا قابل معافی گناہ کرنے تک کی آزادی شریعت عطا کرتی ہے، لیکن نہیں اجازت ہے تو ان غیر مسلموں کو آپس میں سودی لین دین کرنے کی، خواہ وہ اہل ذمہ ہوں یا معاہد و مستامن۔

میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سود اپنی ہر شکل میں مطلقاً حرام ہے، اس میں مجھے کوئی شبہ نہیں، لیکن شبہ مجھے ان معاملات کے بارے میں ہے جنہیں سودی معاملہ تو کہا جاتا ہے لیکن مجھے اطمینان نہیں کہ وہ بہ اعتبار شرع بھی سودی معاملات کہلائے جا سکتے ہیں، میری معروضات کی بنیاد یہ اصول ہے کہ سود وہ ہے جو بہ اعتبار شرع سود ہو نہ کہ وہ جسے لوگ سود کہتے ہوں، اور اسی طرح ہر وہ معاملہ سودی معاملہ ہوگا جو بہ اعتبار شرع سودی معاملہ ہو، خواہ دنیا اسے سود نہ کہے، میں چند مثالوں سے اپنے مدعا کو واضح کرتا ہوں۔

۱- پورے ہندوستان میں قانون حصول اراضی (LAND ACQUISITION ACT) نافذ ہے، اس قانون کے تحت حکومت کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی بھی جائداد غیر منقولہ مثلاً اراضی، باغات مکانات وغیرہ کو جب چاہے مفاد عامہ کی ضرورت کے پیش نظر مالک جائیداد کی رضا مندی کے بغیر بہ ادائیگی معاوضہ حاصل کر سکتی ہے، عملی طور پر اس کی دو صورتیں ہیں: پہلی تو یہ کہ حکومت پہلے اس بات کو مشتہر کرتی ہے کہ فلاں جائداد مفاد عامہ کے پیش نظر حکومت حاصل کرنا چاہتی ہے، جن لوگوں کو اس پر ادعاء ملکیت ہو وہ رجوع ہوں، اور اس جائیداد کی بازاری قیمت کے بارے میں اپنا تخمینہ پیش کریں، اس کے بعد افسر متعلقہ چند رہنما اصولوں کی روشنی میں اس جائیداد کی قیمت متعین کرتا ہے اور وہ رقم مالک کو پیش کی جاتی ہے اور پھر حکومت اس جائیداد کو اپنے قبضے میں لیتی ہے۔ اگر مالک جائیداد اس رقم سے غیر مطمئن ہو تو وہ درخواست دیتا ہے کہ تعین قیمت کے لئے معاملہ سپرد عدالت کر دیا جائے، پھر عدالت تحقیقات کا عمل شروع کرتی ہے اور شہادت لے کر خود قیمت کا تعین کرتی ہے۔ عدالت جس کا تعین کرتی ہے وہ اگر حکومت کی تعین کردہ مالیت سے زیادہ ہو تو عدالت یہ بھی حکم دیتی ہے کہ اس کی متعین کردہ قیمت اور حکومت کی مقررہ کردہ قیمت میں جتنا فرق ہے اس قیمت پر اس مدت کے لئے چھ فیصد سالانہ کی شرح سے سود بھی ادا کیا جائے جو مقدمہ کے سپرد عدالت ہونے کے بعد سے عدالت کے فیصلے تک اور اس کے بغل میں حکومت کی طرف سے بقیہ رقم مالک جائیداد کو ادا ہونے تک گذرے، یہ مدت

بالعموم دو یا تین سال ہوتی ہے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ حکومت کو اگر جائیداد کے حاصل کرنے کی فوری ضرورت ہوتی ہے تو حکومت صرف ایک اعلان جاری کر کے جائیداد پر فوراً قبضہ کر لیتی ہے اور بعد کو اس جائیداد کے مالکوں کو طلب کرنے اور ان سے اس جائیداد کی مالیت کا تخمینہ حاصل کرنے اور پھر خود جائیداد کی مالیت کا تعین کرنے کا عمل شروع کرتی ہے جس کے مکمل ہونے تک دو سال کا عرصہ گذر ہی جاتا ہے اس کے بعد افسر بالآخر متعلقہ مالیت کا تعین کرتا ہے، تو قانوناً یہ لزوم ہے کہ جائیداد پر قبضہ کئے جانے والی تاریخ سے مالیت کا تعین کئے جانے کی تاریخ تک کے عرصہ کے لئے اس پوری قیمت پر چھ فیصد سالانہ شرح سے سود بھی قیمت میں شامل کرے اس کے بعد عدالت سے رجوع کرنے کا وہی عمل بھی ہوسکتا ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس جائیداد کی اصل قیمت پر یہ جو زائد رقم بعنوان ''سود'' قانوناً دی جاتی ہے، کیا وہ شریعت کی نگاہ میں بھی سود اور نتیجۃً حرام ہے؟ ایک تو یہ کہ اس پورے معاملہ میں نہ تو معروف معنی میں راس المال ہے اور نہ ہی قرض کا کوئی عنصر۔ دوسرے یہ کہ اس معاملہ کی مذکورہ اول صورت میں یعنی جبکہ حکومت نے جائیداد پر قبضہ کر لیا ہو اور بعد کو تعین قیمت کا عمل شروع کر کے سال دو سال بعد قیمت ادا کرے، تو کیا بعنوان سود دیئے جانے والی اس اضافی رقم کو مالک جائیداد کی اپنی ملکیت سے حق انتفاع سے اس مدت کے لئے محروم رہنے کا معاوضہ نہیں سمجھا جاسکتا، مان لیجئے کہ ایک اسلامی حکومت میں ایسا ہی حصول اراضی کا قانون نافذ ہو بس اس فرق کے ساتھ کہ موجودہ قانونی اضافہ کو سود لینا اور بعنوان سود ادا کرنا ہے، اسلامی حکومت کا قانون اسی اضافہ رقم کو حق انتفاع واستفادہ سے محرومی کا معاوضہ کہے تو کیا اسلامی حکومت کے قانون کے تحت اس عنوان سے یعنی بعنوان حرجانہ دیا جانے والا اضافہ سود نہ ہوگا اور حکومت کے لئے اس کا دینا اور مالک جائیداد کے لئے اس کا لینا جائز ہوگا؟

اگر جواب اثبات میں ہو تو وہی اضافی رقم جو موجودہ قانون کے تحت بعنوان ''سود'' دی جاتی ہے، وہ اپنی عین میں سود نہیں ہے اور اس کا لینا بھی جائز ہونا چاہئے، اس معاملہ کی اوپر مذکورہ صورت دوم کے بارے میں بھی بعنوان ''سود'' دی جانے والی زائد رقم کے تعلق سے بھی میرے شبہہ کی یہی بنیاد ہے کہ آج جو قیمت مالک جائیداد کو ادا کی گئی لیکن ایک عرصہ بعد عدالت نے اس کو غیر واجبی قرار دے کر اس میں اضافہ کر دیا اور اضافہ شدہ رقم اور پہلی دی ہوئی رقم کے فرق پر چھ فیصد سالانہ کی شرح سے سود کے عنوان سے دلوائی تو کیا بہ عنوان ''سود'' دلائی گئی اس زائد رقم کو حقیقی وصول طلب رقم اور اس کے استفادہ سے اس عرصہ میں محروم رہنے کا معاوضہ یا حرجانہ قرار نہیں دیا جاسکتا؟ اور اگر کوئی اسلامی حکومت اپنے قانون میں اس زائد رقم کو معاوضہ یا حرجانہ قرار دے کر ادا کرنے کی گنجائش رکھے تو علماء اسے شرعاً سود قرار دے کر اس کے حرام ہونے کا فتویٰ دیں گے؟

مذکورہ بالا مثال میں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اس صورت میں قرض کا عنصر موجود نہیں ہے جو سود کی تقریباً تمام ہی صورتوں میں موجود ہوتا ہے۔

۲- (دوسری مثال) فلاحی ریاست کے تصور کے تحت حکومت کی طرف سے کاشتکاروں کو زرعی ترقیاتی قرضے دیئے جاتے ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ زرعی پیداوار میں اضافہ ہوتا کہ ملک کی بڑھتی ہوئی غذا کی ضروریات کی تکمیل ہو سکے، اور دوسرے ملکوں سے غلہ درآمد کرنے کی ضرورت نہ رہے، اور نتیجہ بیرونی زرمبادلہ کی بچت ہو وغیرہ، یہ قرضے مثلاً سینچائی کی غرض سے کنویں کھودنے، ٹیوب ویل لگانے، اور ٹریکٹر وغیرہ خریدنے کے لئے دئے جاتے ہیں، اور ایک مقررہ شرح سود کے ساتھ قسطوں پر واپس لئے جاتے ہیں۔ ان قرضوں کے لئے وصول ہونے والی درخواستوں کی تنقیح سے لے کر درخواست گذار کو رقم کی ادائیگی اور پھر اس کی بالاقساط واپس وصولی تک کے عمل میں متعدد سرکاری

اعمال کی کارکردگی شامل ہوتی ہے اور بحیثیت مجموعی اس شعبہ کے نظم کے لئے حکومت کو خاصے مصارف برداشت کرنے ہوتے ہیں، جب کہ ان قرضوں کو دینے سے حکومت کا مقصد نفع کمانا ہرگز نہیں ہوتا۔

میرا سوال یہ ہے کہ ان معاملات میں حکومت اپنے رأس المال پر مدت کے معاوضے میں جو اضافی رقم ایک متعین شرح سے بعنوان سود وصول کرتی ہے، اس کی بجائے اگر وہ اس زائد رقم کو انتظامی مصارف قرار دے کر وصول کرے، جبکہ فی الواقع اس معاملہ میں حکومت پر مصارف کا اچھا خاصا بوجھ پڑتا ہی ہے، تو کیا راس المال پر وہ اضافہ شرعاً جائز ہوگا اور مسلمانوں کے لئے اس نظم کے تحت قرض لینا اور کچھ اضافہ کے ساتھ واپس کرنا مباح ہوگا؟

اگر جواب اثبات میں ہے تو کیوں نہ اسی پر موجودہ صورت معاملہ کو قیاس کرتے ہوئے بعنوان سود وصول کی جانے والی رقم کو انتظامی مصارف سمجھ کر مباح قرار دیا جائے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ عرض کر دوں، چند برس ہوئے کہ ایشیا کی ترقیاتی بینک (ASIAN DEVELOPMENT BANK) کے ایک ڈائریکٹر سے جو پاکستانی تھے میری گفتگو ہو رہی تھی، انہوں نے مجھے بتایا کہ بعض مسلم ملکوں کی حکومت نے بینک سے نمائندگی کی کہ بینک چونکہ سود پر قرض دیتا ہے اس لئے اس بینک سے سود لینے پر ان کے ملک کے مسلمانوں کے ایک طبقہ کو اعتراض ہے، اس پر بنک نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ رأس المال پر اضافہ کو بجائے سود کے انتظامی مصارف SERVICE CHARGE & ADMINISTRATIVE کا عنوان دے گا جبکہ بینک کا نظام جوں کا توں باقی رہے گا۔

۳- انڈین آئیل کارپوریشن مرکزی حکومت کا ایک تجارتی ادارہ ہے، اسے اندرون ملک نکلنے والے پٹرول اور گیس وغیرہ فروخت کی اجارہ داری حاصل ہے، اور اس میدان میں کوئی اس کا حریف نہیں ہے، اس کارپوریشن میں کچھ رقم حکومت کی لگی ہوئی ہے اور کچھ رقم پبلک کی ہے جو اس کارپوریشن کے حصص SHARE فروخت کرنے کی شکل میں کارپوریشن کو ملی ہے، اس مشترکہ سرمایہ سے یہ کارپوریشن اپنا کاروبار کرتا ہے، لیکن کارپوریشن کے حصص مضاربت کے اصول پر فروخت نہیں کئے جاتے بلکہ کارپوریشن انہیں متعین حصص کی مالیت پر سودا کرنے کے اقرار سے فروخت کرتا ہے، اور ختم سال پر اسی شرح سے حصص کے مالکوں کو سود ادا کر دیا جاتا ہے، یہ کارپوریشن سال کے ختم ہونے پر سال بھر کے نفع ونقصان کا میزانیہ بھی تیار کر کے مشتہر کرتا ہے، میرا یہ سوال ہے کہ اگر ایک مسلمان اس کارپوریشن کے حصص کے خریدتے وقت دل میں یہ نیت رکھے کہ وہ اسلامی اصول مضاربت کے تحت سرمایہ کاری BALANCE SHEET کر رہا ہے اور ختم سال پر جب کارپوریشن کا بیلنس شیٹ اس کے سامنے آئے گا تو اگر اسے پتہ چلے کہ کارپوریشن کو اس سال خسارہ ہوا ہے تو وہ اس کے حصص پر بعنوان سود ملنے والی رقم نہیں لے گا اور اگر منافع ہوا لیکن باعتبار حصہ رسدی اس سے کم ہوا جتنا کارپوریشن بشکل سود مقررہ سے ادا کر رہا ہے تو وہ صرف اتنا بطور منافع قبول کرے گا جتنا باعتبار حصہ رسدی اس کے حصّہ میں آنا چاہئے، تو کیا اس نیت کے ساتھ ایک مسلمان کا ان حصص کو خریدنا اور منافع اور نقصان کے میزانیہ کی روشنی میں وہ عمل کرنا جس کا میں نے ذکر کیا جائز ہوگا؟

۴- اس سال کی آخری ماہ جولائی یا آغاز اگست میں ہندوستان کے ایک فوجی محمد یونس کے معاملہ کا اخبارات میں چرچا ہوا تھا۔ یہ صاحب ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ میں محاذ پر زخمی ہو گئے تھے اور ایسے زخمی ہوئے تھے کہ فوجی خدمت کے اہل نہیں رہے، چنانچہ انہیں خدمت سے سبکدوش DISCHARGE کر دیا گیا، لیکن واجبات جواز روئے ضوابط ایسی صورت میں محکمہ فوج سے وصول شدنی قرار پائے تھے ادا نہیں کئے گئے، محمد یونس اس بارے میں مختلف محکمہ جاتی سطحوں پر کوشش کرتے رہے اور ہر جگہ ناکام ہو کر بالآخر عدالت میں رجوع ہوئے اور عدالت

نے ان کے حق میں فیصلہ دیکر اس رقم کا تعین کیا جو حکومت انہیں ادا کرے اور ساتھ ہی یہ حکم دیا کہ ۱۹۶۵ء سے تاریخ ادائیگی تک یعنی تقریباً چوبیس سال کی مدت کے لئے حکومت اس رقم پر چھ فیصد سالانہ شرح سے سود بھی مزید ادا کرے۔

اس معاملہ میں یہ بات بھی ظاہر ہے کہ محمد یونس کو وادا شدنی جس رقم کا تعین عدالت نے ۱۹۸۹ء میں کیا وہ رقم اصلاً محمد یونس کو ۱۹۶۵ میں واجب الادا تھی، لیکن حکومت کی غفلت کی وجہ سے ۲۴ سال تک وہ اس رقم سے استفادہ کرنے سے محروم رہے، اور اس عرصہ میں مختلف سطحوں پر اپنے جائز حق کے حصول کے لئے کوشش کرتے رہے، اور بالآخر عدالت میں رجوع ہونے کے سلسلہ میں جو مالی زیر باری، وقت اور توانائی کا زیاں، اور ذہنی پریشانی میں وہ مبتلا رہے پوشیدہ نہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر ایسا معاملہ کسی اسلامی حکومت میں پیش آئے اور وہاں بھی شخص متعلقہ کو اتنے طویل مراحل سے ناکام گذرنے کے بعد بالآخر قاضی کی عدالت سے انصاف ملے، اور قاضی یہ حکم دے کہ اصل واجب الاداء رقم کے علاوہ ایک متعین رقم حکومت اس شخص کو بطور حرجانہ تاوان مزید ادا کرے تو کیا وہ زائد رقم باعتبار شرع سود قرار دی جاسکے گی؟

اگر جواب نفی میں ہو تو کیا محمد یونس کو جو زائد رقم اس معاملہ میں عدالت نے بعنوان سود دلوائی ہے اس کو حرجانہ پر قیاس کرکے اس کے حق میں جائز قرار نہیں دیا جاسکتا؟

☆☆☆

تجاویز:

تیسرا فقہی سمینار بنگلور کے مشہور دینی ادارہ دارالعلوم سبیل الرشاد میں ۸ تا ۱۱ر جون ۱۹۹۰ء مطابق ۱۳-۱۶ر ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ کو منعقد ہوا۔

☆ اسلامی بنکاری

☆ مرابحہ

☆ حقوق کی خرید وفروخت

سمینار کے زیر بحث موضوعات تھے۔ علماء اور جدید علوم کے ماہرین نے چار روزہ اجتماعی غور ومباحثہ کے بعد درج ذیل تجاویز و فیصلوں کو منظوری دی، دینی مدارس اور عصری درسگاہوں کے طلبہ کی بابت بھی اہم تجاویز کی سفارش کی گئی۔

۱-اسلامی بنکاری-ضرورت ورہنما خطوط:

دور حاضر کے مالیاتی اور اقتصادی نظام میں بینک ایک کلیدی حیثیت کا حامل ہے، فاضل سرمایہ کو جمع کر کے مختلف اقتصادی ضروریات کی تکمیل کے لئے اس کے ذریعہ سرمایہ بھی فراہم ہوتا ہے اور قومی پیداوار میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ مزید برآں بینکنگ ادارے متعدد ایسی خدمات بھی انجام دیتے ہیں جو تجارت، صنعت اور زراعت کے لئے ناگزیر ہیں۔ ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کی معاشی جدوجہد اور سرمایہ کاری بھی اس امر کی محتاج ہے کہ وہ موجودہ بینکوں کی طرف رجوع کریں۔ مگر یہ پورا نظام بینکنگ سود کی بنیاد پر قائم ہے جسے اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ سودی نظام غیر عادلانہ اساس پر قائم ہے۔ سود پر مبنی عقد سرمایہ دار کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ وہ ہر حال میں ایک متعین شرح پر منافع وصول کرے، جب کہ صاحب العمل (Entreneur) کا منافع اس کی اقتصادی جدوجہد کی کامیابی یا ناکامی پر منحصر ہے۔ اسلام کے نزدیک یہ عقد فاسد ہے؛ کیونکہ یہ ظلم پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ سود موجودہ زمانہ میں تفریق دولت اور ترکیز سرمایہ (Concentration of Wealth) کا مؤثر ترین ذریعہ بن گیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں موجودہ معاشرہ میں قرض پر دیئے جانے والے سرمایہ (Loan Capital) کو جو تسلط اور قاہرانہ حیثیت حاصل ہوگئی ہے اس کا شعور تقریباً سارے ہی اصحاب فکر کو کسی نہ کسی درجہ میں حاصل ہوگیا ہے۔

سود کے مفاسد کا یہ ایک مجمل بیان ہے، اس کے مضر اور ظالمانہ اثرات کا حصر یہاں ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ شریعت انسان کی معاشی جدوجہد کی اہمیت کی نہ صرف یہ کہ منکر نہیں ہے بلکہ وہ اس جدوجہد کو ابتغاء فضل اللہ قرار دیتی ہے۔ یہ شریعت انسانوں کے معاشرہ میں بالعموم اور معاشی جدوجہد کے میدان میں بالخصوص عدل ورحمت، دیانت اور امانت کی نہ صرف مقتضی ہے بلکہ وہ بھی ایسے احکام، اصول اور اقدار بھی فراہم کرتی ہے جن پر ایک صحت مند، عادلانہ اور مشفقانہ نظام معیشت قائم ہوتا ہے، سود کی حرمت فی الحقیقت اسی مقصد کے پیش نظر کی گئی ہے۔ اسلامی نظام معیشت ظالمانہ مقابلہ اور تنافس کے بدلے باہمی اخوت، عدل اور مساوات اور عام

انسانوں کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ کی وسیع بنیادوں پر قائم ہے۔

ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ اپنی معاشی سرگرمیوں کو بھی انہی بنیادوں پر استوار کریں؛ تاکہ ایک طرف وہ اس نظام عدل ومساوات کے داعی بن سکیں اور دوسری طرف اپنی معاشی اور معاشرتی زندگی کو بہتر اور مضبوط بنیادوں پر قائم رکھ سکیں۔

غیر سودی بنیادوں پر بینکنگ کے نظام کے لئے شریعت حقہ نے جو اصول وضوابط عطا فرمائے ہیں وہ موجودہ دور کے مسائل کا بہتر حل پیش کرتے ہیں؛ بلکہ ہمیں یقین ہے کہ اپنی کارکردگی کے اعتبار سے وہ موجودہ طریق تنظیم سے بہتر ہیں۔ ان کے اختیار کرنے سے مسلمانوں کی معاشی حالت بھی بہتر ہوگی اور ایسا عادلانہ معاشرہ قائم ہوگا جس کا ہمارا ملک بدرجہ اولیٰ محتاج ہے۔ یہ سمینار سمجھتا ہے کہ مضاربت (Equity Participation)، مشارکت (Partnership) اور مرابحہ (Mark up Pricing) جیسے اصولوں سے قابل عمل اور بہتر نظام بینکنگ قائم کیا جاسکتا ہے، یعنی ایسا نظام مالیات اور سرمایہ کاری جو ملک کے لئے ایک پیغام بھی ثابت ہو اور قابل عمل نمونہ بھی۔ البتہ اس سمینار کو اس بات کا مکمل شعور ہے کہ موجودہ عصر کے متعدد مسائل اور سرمایہ کاری کے متعدد وسائل اور معاملات کے پیش نظر ان اصولوں کے انطباق کے لئے ہمیں انتھک جدوجہد کرنا ہوگی- اسلامی نظام بینکنگ کا خاکہ مرتب کرتے وقت مندرجہ ذیل اصولی ہدایات کو ملحوظ رکھنا ہوگا:

۱- اسلام سودی نظام تعاقد کی ہر شکل کو حرام قرار دیتا ہے۔

۲- اسلام مالیاتی اور اقتصادی عقد میں جانبین کے لئے عدل کو ضروری شرط قرار دیتا ہے، جس کا مقتضی یہ ہے کہ صاحب المال اور صاحب العمل دونوں کے ساتھ عدل ہو، صاحب المال منافع میں شریک ہو اور سرمایہ کے نقصان کا مکمل ذمہ دار قرار دیا جائے، جب کہ صاحب العمل (مستقرض) نفع میں شریک ہو اور بصورت نقصان وہ اپنی محنت کی اجرت سے محروم ہو۔

۳- زر کو وسیلہ سمجھا جائے نہ کہ مطلوب بالذات، جس طرح بضائع ضروریہ اور عیش وراحت کے سامان ہوتے ہیں۔

۴- سرمایہ کو اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھا جائے اور اس کے ذریعہ انسانوں کی حقیقی ضروریات اور ان کی مالی اور اقتصادی استعداد میں اضافہ کا ذریعہ بنایا جائے، برعکس موجودہ طریق تصرف کے، جہاں سرمایہ کو صاحب المال اور بینک اپنی ازدیاد دولت کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

۵- سرمایہ کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ کمزور اور پسماندہ طبقات کی معاشی حالت میں بہتری ہو اور نامنصفانہ تقسیم اور تفریق دولت میں کمی واقع ہو۔ اس اصول کے پیش نظر اسلامی بینکوں کو سرمایہ کی تقسیم اور فراہمی کرتے وقت ضروریات، تحسینیات اور کمالیات میں اول الذکر کو ترجیح دینا ہوگا، اور شرح منافع کے ساتھ اس امر کا بھی لحاظ کرنا ہوگا کہ ملت کے کمزور اور ضعیف صاحبان استعداد کی ہمت افزائی کی جائے۔

۶- ان تمام وسائل تمویل سے احتراز کرنا ہوگا جو اگرچہ عصر حاضر میں مروج ہیں لیکن خیانت، دھوکہ اور کتمان حقیقت کے شاہکار ہیں۔

۷- ان اصولی ہدایات اور اسلامی نظام معیشت ومعاشرت کے عمومی مقاصد، اس کی اخلاقی روح، دیانت وصداقت کی عملی اقدار کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا؛ تاکہ یہ کوشش محض ایک میکانکی مشن نہ بن جائے بلکہ حقیقی معنوں میں جاری نظام منافعت، لوٹ کھسوٹ، نفسانیت کی جگہ پر نظام رحمت اور باہمی خیرسگالی اور تعاون کا آئینہ دار ہو۔

اسی مقصد کے پیش نظر سمینار نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ماہرین اور علماء پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جائے جو شریعت کے مذکورہ اصول اور اس کی عمومی ہدایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہندوستان کے حالات اور مسلمانوں کے مسائل کے پیش نظر ایسا نظام مالیات تجویز کرے جو

مسلمانوں کی امنگوں اوران کی پسندیدہ اقدار کا آئینہ دار بھی ہو اوران کے حقیقی معاشی مسائل کا حل بھی۔

۲-مرابحہ اورسرمایہ کاری کے لئے اس سے استفادہ:

یہ سمینار منعقدہ ۸ تا ۱۱ر جون ۱۹۹۰ مطابق ۱۳ تا ۱۶ر ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ مرابحہ سے متعلق غوروخوض کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ:

۱- مرابحہ کا فقہاء کے نزدیک ایک متعین مفہوم ہے۔

۲- اسلامی بینکوں میں مرابحہ جن شکلوں میں رائج ہے وہی شکلیں اس سمینار میں زیر بحث ہیں۔

۳- مشہور فقہی قاعدہ ہے کہ عقود ومعاملات میں مقاصد کا اعتبار ہوتا ہے محض الفاظ کا اعتبار نہیں ہوتا، لہذا مرابحہ کے نام پر جو معاملات مروج ہیں ان کی حقیقت کا اعتبار ہے محض ان کے ناموں کا اعتبار نہیں ہے۔

۴- اسلامی بینکوں میں استعمال ہونے والی مرابحہ کی شکلیں مرابحہ کی معروف شرطوں کے ساتھ اسی صورت میں جائز ہوں گی جب کہ:

الف- بینک کی طرف سے جاری کردہ مخصوص فارم (Quotation) میں بینک کے ذریعہ فروخت کی جانے والی اشیاء کی نوعیت، ان کی کیفیت (Quality) اور دوسری ضروری صفات واضح طور پر ذکر کی گئی ہوں؛ تاکہ جہالت اور ابہام کی وجہ سے معاملہ کے ہر دو فریق کے درمیان کسی نزاع کا امکان باقی نہ رہے، نیز اس قیمت خرید یا لاگت پر بینک کو ملنے والے نفع (قیمت)، اس کی ادائیگی کی مدت اور اقساط کی صراحت کردی گئی ہو۔

ب- یہ درست نہیں ہوگا کہ معاملہ کرتے وقت یہ کہا جائے کہ اگر نقد خریدا جائے تو یہ قیمت ہوگی اور ادھار خریدا جائے تو دوسری قیمت، یا ادھار کی مدت کے کم یا زیادہ ہونے پر قیمت کی کمی اور زیادتی کا ذکر معاملہ کرتے وقت کیا جائے، بلکہ بینک خریدار کو مطلوبہ سامان کا نمونہ دکھا کر وضاحت کرے کہ اس کی قیمت اتنی مدت میں اتنی قسطوں میں ادا کرنی ہوگی، اور بینک کو اس کی لاگت پر اتنا منافع دینا ہوگا (اور یہی بینک سے خریداری کی قیمت ہوگی)۔

۳-غیر سودی امدادی سوسائٹیاں:

تیسرے فقہی سمینار میں غیر سودی امدادی اداروں اوران سے متعلق مسائل پر غور کیا گیا، یہ سمینار غور وفکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ:

۱- ہندوستانی مسلمانوں کے اقتصادی اور معاشی حالات کے پیش نظر ایسے امدادی مالیاتی اداروں کا قیام ضروری اور مفید ہے جو عامۃ المسلمین سے بلاسود قرض حاصل کریں اور ضرورت مند مسلمانوں کو سود کی ادنیٰ آمیزش کے بغیر قرض فراہم کرسکیں۔

ایسے ادارے دراصل رفاہی اور فلاحی ادارے ہوتے ہیں جن کی بنیاد صلہ، احسان اور تعاون پر ہوتی ہے۔

۲- قرض خواہوں سے قرض میں دی گئی رقم سے زائد وصول کرنا، چاہے اس کا کوئی سا بھی طریقہ اختیار کرلیا جائے، ہرگز جائز نہیں، اور قرض سے زائد حاصل کی گئی رقم شرعاً سود ہے۔ لہذا ذاتی مفاد یا ادارے کے مفاد یا دیگر رفاہی اسکیموں پر خرچ کرنے کے لئے بھی قرض سے زائد کوئی رقم وصول کرنا جائز نہیں، نیز ان اداروں میں جمع شدہ رقوم کو فکسڈ ڈپازٹ میں رکھنا اوران پر سود حاصل کرنا بھی حرام ہے۔

رہا یہ سوال کہ ایسے اداروں کے انتظامی مصارف کس طرح پورے کئے جائیں تو یہ ''فقہی سمینار'' اس کے لئے مندرجہ ذیل طریقوں کو

درست قرار دیتا ہے:

الف- ایسے مالیاتی اداروں کو کچھ اصحاب خیر ایک ملی ضرورت سمجھ کر محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے اپنے خرچوں سے چلائیں، یعنی انتظامی اخراجات کا بار یہ اصحاب خیر برداشت کریں۔ اگر یہ ادارے مسلمانوں میں اپنا یہ اعتماد حاصل کرلیں کہ یہ خالص شرعی حدود میں عام مسلمانوں کی مالی امداد کے لئے اور ان کو سودی لین دین سے بچانے کے لئے کام کررہے ہیں اور علماء کرام کی رہنمائی بھی ان کو حاصل ہے تو قوی امید ہے کہ اہل ثروت مسلمان ایسے اداروں کے انتظامی مصارف بلکہ ترقیاتی مصارف کے لئے بھی آگے بڑھیں گے۔

ب- سمینار کی رائے میں ایسے تمام امدادی مالی اداروں کو ہرطور پر یہ کوشش کرنی چاہئے کہ سرمایہ کا کچھ حصہ پیداواری ذرائع میں لگا کر جائز آمدنی حاصل کی جائے، اور کم ازکم اتنی آمدنی ضرور حاصل کرلی جائے جس سے سوسائٹی کے انتظامی اخراجات پورے کئے جاسکیں۔

ج- سمینار کے شرکاء میں سے متعدد علماء کی رائے یہ ہے کہ اجر الخدمۃ (Service Charge) یا انتظامی اخراجات (Operational Expenses) اگرچہ وہ ضروری اور واقعی اخراجات تک محدود ہوں، قرض خواہوں سے نہیں لئے جاسکتے۔ بعض علماء کی رائے میں اگرچہ یہ اصلاً جائز ہیں لیکن سود کا دروازہ کھل جانے کا خطرہ ہے، اس لئے اسے قطعی طور پر ممنوع قرار دیا جانا چاہئے۔

دیگر علماء (شرکاء سمینار) کی رائے میں اس طرح کے اداروں کا قیام مفید اور ضروری ہے، اور اگر اصحاب خیر کی طرف سے تعاون یا پیداواری ذرائع میں سرمایہ لگا کر بقدر ضرورت جائز آمدنی حاصل کرکے بھی ادارہ چلانا ممکن نہیں ہوتو ادارے کے ضروری اور حقیقی انتظامی اخراجات قرض خواہوں سے وصول کئے جاسکتے ہیں کہ اس ادائیگی کا کوئی نفع نہ سرمایہ جمع کرنے والوں کو پہنچتا ہے اور نہ ادارہ کے لئے ذریعہ آمدنی ہے۔

ان علماء کی رائے میں ان واقعی اور ضروری اخراجات کے تعین میں اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اصلاً قرض کی جو روح شریعت کے پیش نظر ہے اس کے ساتھ قرض خواہوں سے ان اخراجات کا وصول کرنا میل نہیں کھاتا؛ لیکن ان اخراجات کے وصول کرنے کی اجازت ناگزیر حالت کی وجہ سے دی جارہی ہے۔ لہٰذا ان اخراجات کے تعین میں حد درجہ احتیاط برتی جائے۔

ضروری اور واقعی اخراجات محتاط اندازے کے ساتھ متعین کئے جاسکتے ہیں؛ لیکن اگر حسابی مدت کے پورا ہونے کے بعد یہ معلوم ہو کہ انتظامی اخراجات کی مد میں وصول کی گئی تخمینی رقم حقیقی اخراجات سے زائد ہو تو یہ زائد رقم قرض خواہوں کو وصول کئے گئے خرچ کے تناسب سے واپس کردینا واجب ہوگا۔

۴-حقوق کی خرید وفروخت:

یہ سمینار منعقدہ ۸، ۹، ۱۰، ۱۱؍ جون ۱۹۹۰ء حقوق کی خرید وفروخت کے مسئلہ پر کافی غور وخوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ:

۱- بیع میں مال کی شرط جوہری ہے۔

۲- مال کی حقیقت نصوص شرعیہ نے متعین نہیں کی ہے۔ پس اس کا اصل مدار ہر عہد کے اس عرف ورواج پر ہے جو شریعت سے متصادم نہ ہو۔

۳- وہ تمام حقوق جن کی مشروعیت اصالۃً نہیں بلکہ صاحب حق سے کسی ضرر کو دور کرنے کے لئے ہوتی ہے، ایسے حقوق پر عوض لینا جائز نہیں جیسے شفعہ۔

۴- جو حقوق نصوص شرعیہ سے ثابت ہوں؛ البتہ ان سے مالی منعفت متعلق ہوگئی ہو اور عرف میں ان کا عوض لینا مروج اور معروف ہو چکا ہو، نیز ان کی حیثیت محض دفع ضرر کی نہ ہو اور نہ وہ شریعت کے عمومی مقاصد و مصالح سے متصادم ہوں، ایسے حقوق پر عوض حاصل کرنا جائز اور درست ہے۔

۵- کون سے حقوق کس نوع میں داخل ہیں، اور اس تفصیل کے مطابق عصر حاضر میں مروج کون سے حقوق قابل عوض ہیں اور کون قابل عوض نہیں ہیں؟ ان کی تعیین وتطبیق کے لئے مستند دار الافتاء اور اصحاب فتویٰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

۵- دینی وعصری اداروں کے طلبہ سے متعلق تجاویز:

یہ سمینار عربی مدارس کے ذمہ داروں سے درخواست کرتا ہے کہ:

۱- طلبہ کو جدید حالات پر احکام شرعیہ کے انطباق کا اہل بنانے کے لئے فقہی سمینار میں آنے والے مسائل اور دوسرے جدید مسائل پر طلبہ کا بین المدارس مذاکرہ منعقد کرائیں، اور اگر مدارس خواہش کریں تو اسلامک فقہ اکیڈمی ایسے مذاکروں میں تعاون کے لئے ممتاز علماء میں سے کسی صاحب سے ایسے مواقع پر شرکت کے لئے درخواست کرسکتی ہے۔

۲- دینی مدارس کے طلبہ کے لئے سمینار یہ بھی مناسب سمجھتا ہے کہ معاشیات اور مختلف عصری علوم کے محاضرات کا نظم کیا جائے؛ تاکہ طلبہ ان علوم کی مبادیات اور اس کی بنیادی فکر کو سمجھ سکیں اور احکام شرعیہ کو ان سے مربوط کرسکیں، اسلامک فقہ اکیڈمی اس سلسلہ میں ممکن تعاون کے لئے تیار ہے۔

یہ سمینار اس بات کی بھی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ عصری درسگاہوں کے طلباء و باحثین کے لئے ایسے محاضرات اور کیمپس (Camps) کا نظم کیا جائے کہ اس کے ذریعہ ان کو اسلام کے مختلف شعبوں کی بنیادی تعلیمات، اسلام کے بنیادی اصول تعلیم، اسلامی قانون کی تاریخ اور اس کی ہر عہد میں انسانیت کی رہنمائی کی صلاحیت اور ضروری اصطلاحات سے واقف کرایا جائے۔ سمینار کی خواہش ہے کہ اسلامک فقہ اکیڈمی اس سلسلہ میں مناسب اقدام کرے۔

✦✦✦